میں نے جمعیت سے کیا پایا؟

خرم جاہ مراد
خورشید احمد

ادارہ مطبوعات طلبہ
۱۔اے: ذیلدار پارک اچھرہ، لاہور فون 042-37428307

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب	:	میں نے جمعیت سے کیا پایا؟
مصنف	:	خرم جاہ مراد/خورشید احمد
ناشر	:	ضیاءالدین (مینیجنگ ڈائریکٹر)
اہتمام	:	ادارہ مطبوعات طلبہ لاہور
مطبع	:	قاسم پرنٹرز
کمپوزنگ	:	قاسم گرافکس لاہور
اشاعت	:	
تعداد	:	
قیمت	:	

ادارہ مطبوعات طلبہ

1-اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور 042-37428307

پہلی بات

اٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے لیکن
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی نے جمعیت میں شعوری دن گزارے ہوں اور عمر بھر ان کا میٹھا ثمر نہ پایا ہو۔ قدم قدم پر اپنے رب کی ان نعمتوں اور احسانات کا احساس اللہ کا ایک بہت ہی عظیم انعام و فضل ہے جو اس نے اپنے مخلص، بے لوث اور محبت کرنے والے نوجوانوں کے لیے عنایت کیا ہے۔ اس گھنے سایہ دار شجر طیب کی ٹھنڈک کا احساس آپ کو ان دو تحریروں میں بھی ملے گا۔ جو جمعیت کے دو سابق ناظمین اعلیٰ نے جمعیت میں گزرے ایام کے حوالے سے دل کی زبان سے لکھی ہیں۔ یہ فی الحقیقت اس گئے گزرے دور میں جمعیت ہی کے اثرات ہیں کہ نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد کے سینے اللہ اور اس کے رسول کی محبت سے منور ہیں۔ یہی اثرات ہیں جو کبھی دل کو گرماتے ہیں کبھی روح کو تڑپاتے ہیں، کبھی ہاتھ بن کر غلبہ دین کا پھریرا لہراتے ہیں اور کبھی پاؤں بن کر خدا کی راہ پہ خاک آلود ہوتے ہیں، کبھی نگاہیں بن کر جنت کی تلاش میں کھو جاتے ہیں اور کبھی غلطیوں و کوتاہیوں کا احساس کر کے رلاتے ہیں۔

یہ کتاب جہاں جمعیت کے کارکنان کے جذبوں کو توانائی دے گی وہاں جمعیت کو سمجھنے والے صاحبان علم و فہم کو بھی تصویر کا اصل رخ دکھائے گی۔ انشاءاللہ

ضیاءالدین
مہتمم ادارہ مطبوعات طلبہ

خرم مراد

۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء تک جمعیت کے رکن رہے۔ کراچی میں جمعیت کے اولین کارکنوں میں تھے۔ کراچی جمعیت کے ناظم بھی رہے۔ ۵۲-۱۹۵۱ء میں نظامت اعلیٰ کی ذمہ داری سنبھالی۔ دستور جمعیت کی ترتیب وتدوین انہی کے دور میں ہوئی۔

ڈی- جے کالج سے انٹر سائنس اور این ای ڈی کالج سے بی ای کیا۔ بعد میں مینوسوٹا یونیورسٹی امریکہ سے ایم ایس کی ڈگری لی۔ پاکستان واپس آ کر ایک انجینئرنگ فرم میں ملازمت اختیار کی اور سقوط ڈھاکہ تک اس میں چیف انجینئر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ قرآن حکیم کا وسیع مطالعہ اور قلب و روح کو تسکین پہنچانے والا درس قرآن موصوف کا نشان امتیاز تھا۔ براہ راست دلوں کو جگاتے تھے۔

''تحریک اسلامی میں کارکنوں کے باہمی تعلقات'' ان کی پہلی باقاعدہ کتاب تھی۔ دوسری تصنیف کا شرف زیر نظر کتابچہ کو حاصل ہو رہا ہے اور اس کے علاوہ درجنوں موضوعات پر لکھنے کا شرف حاصل کیا۔ تحریک اسلامی کے سرگرم کارکن تھے سقوط ڈھاکہ سے ایک سات بیشتر تک ڈھاکہ کے امیر بھی رہے، سقوط ڈھاکہ کے سانحہ کے بعد جنگی قیدی کی حیثیت سے بھارت منتقل کر دیئے گئے۔ رہائی کے بعد تہران اور سعودی عرب میں انجینئرنگ کے اہم منصوبوں کی نگرانی کی، پھر دس سال برطانیہ رہے۔ جماعت اسلامی لاہور کی امارت، نائب امیر جماعت اسلامی اور قائمقام امیر جماعت اسلامی پاکستان جیسی ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برا ہوئے۔ 19 دسمبر 1996ء کو دل کے آپریشن کے بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں

جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی شعاعیں اپنے دامن میں روشنی اور حرارت کا خزانہ لے کر کائنات کے ایک ایک گوشے میں پھیل جاتی ہیں اور ریگستان کے نامعلوم کتنے حقیر اور کم مایہ ذرات ہوتے ہیں کہ ان شعاعوں سے مس کرتے ہی ان میں زندگی اور حرارت کی رو دوڑ جاتی ہے اور وہ چمک اٹھتے ہیں۔ اگر کوئی ذرہ اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کو بھول کر یہ سمجھ بیٹھے کہ اس کی ساری آب و تاب اس کی اپنی ہے تو اس سے بڑی کوئی خود فریبی نہیں ہوسکتی اور اگر وہ چمکتے ہوئے سورج یا روشنی کی پیامبر شاعوں کو ہی اپنا محسن سمجھ کر ان کے آگے سجدہ ریز ہو جائے تو اس سے بڑھ کر کوئی کم فہمی بھی نہیں ہوسکتی۔ ذرہ اگر چمکا تو اس کی چمک دمک کے لیے شکر و تعریف کی سزاوار صرف وہ ذات ہے جس نے اپنے نور سے اس کائنات کو فیض یاب کیا اور ذرہ کی سرشت میں یہ استعداد رکھی کہ وہ اس نور کو جذب کر کے بھڑک اٹھے اس لیے کہ آسمانوں اور زمین میں نور اللہ ہی کا ہے۔ (مومن کی مثال ایسی ہے) کہ (النور آیہ ۳۵) زیتون کا تیل قریب ہے کہ بھڑک اٹھے اگرچہ آگ اس کو نہ بھی چھوئے روشنی پر روشنی، اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی روشنی کی طرف راستہ بنا دیتا ہے۔

اگر کہیں جمال ہے تو اسی کا دیا ہے، اگر کہیں کمال ہے تو اسی کی طرف سے ہے، اگر کہیں حسن ہے تو اسی کی بخشش ہے، اگر کہیں خوبی ہے تو اسی نے دی ہے اور اگر کہیں صلاحت و استعداد ہے تو اسی کی عنایت ہے۔

☆☆☆☆☆

ہم کسی طرح بھی ریت کے ان ذروں سے زیادہ قدر و قیمت اور حیثیت کے مالک نہ تھے جو ریگستان میں پڑے پڑے صبح و شام کی نامعلوم کتنی گردشیں گزار دیتے ہیں اور کسی کی بھی نگاہوں میں ان کی کوئی وقعت نہیں ہوتی، لیکن ہم پر ہمارے مالک کا احسان یہ تھا کہ اس نے ہمارے اوپر دعوت اسلامی کے روشن سورج کو چمکایا اور اس کی تابانی اور حرارت میں سے ہم کو بھی

حصہ عنایت فرمایا۔ جن شعاعوں نے روشنی و زندگی کا یہ خزانہ ہم تک منتقل کیا، ان میں سب سے زیادہ موثر اور سب سے زیادہ تیز شعاع وہ تھی جس نے اسلامی جمعیت طلبہ کا قالب اختیار کیا۔ اسلامی جمعیت طلبہ کیا تھی؟

(یہ چند نوجوان تھے کہ جب وہ غار پر پہنچے تو ان کے دل کی یہ پکار تھی کہ اے مالک! ہم کو اپنے پاس سے خزانہ رحمت عطا فرما اور ہمارے کاموں کو سیدھے راستے سے لگا دے.....، اور جس مسلک پر وہ قائم ہو گئے وہ یہ تھا کہ ''ہمارا مالک و آقا تو بس صرف وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔'' (الکہف:10-14)

چند نوجوانوں نے مل کر ایک عمارت کی بنیاد ڈالی تا کہ وہ اس کے سایہ میں اپنے مالک سے ہدایت و ایمان اور اطاعت و جہاد کی رحمتیں پا سکیں۔ تا کہ ان کی زندگیاں، پوری کی پوری زندگیاں صرف خدا کی بادشاہت قائم کرنے کے لیے اپنے جسم و جان کی ساری قوتوں کی بازی لگا دیں اور اس طرح وہ خدا سے اپنے معاہدہ بیع کی تکمیل کی کوشش کر سکیں جو انہوں نے ایمان لاتے ہی کیا تھا اور جس کے ذریعے وہ اپنی جان اور مال کی قیمت جنت کی صورت میں وصول کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔

(بیشک اللہ نے ایمان لانے والوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے۔ اس قیمت پر کہ ان کو جنت ملے گی۔'' (توبہ:11)

اس عمارت کی بنیاد ڈالنے اور دیواریں کھڑی کرنے کی سعادت میں میرے ہاتھ بھی شریک تھے اور اس عمارت کے سائے میں خدا نے اپنی جن رحمتوں کی بارش کی ان میں میری روح اور میری زندگی نے بھی اپنا حصہ پایا اور اب مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ میں یہ بتاؤں کہ میں نے کیا پایا؟

☆☆☆☆☆

جب زندگی پے در پے سفر کی منزل طے کرتی ہوئی اپنی آخری منزل کی طرف بڑھ رہی ہو

تو اس کے لیے یہ کام کتنا مشکل ہے کہ وہ رک کر اور پیچھے مڑ کر یہ دیکھے کہ وہ اپنے دامن میں کیا کچھ سمیٹتی چلی آئی ہے۔ ایک وقت آئے گا جب زندگی کے لیے ایک نئے دور کا دروازہ کھول دیا جائے گا اور وہ اس میں داخل ہو کر اس دنیا کی سرحد عبور کر جائے گی۔ وہی وقت ہوگا جب اس کو یہ معلوم ہوگا کہ فی الواقع اس نے کیا پایا اور کیا کھویا، وہ بازی ہار گیا یا جیت گیا اس نے اپنے دامن میں رحمت کے پھول چن چن کر جمع کیے تھے یا عذاب کے کانٹے بھرے تھے۔

(جس دن اللہ تم سب کو جمع کرے گا یہی ہار جیت کے فیصلے کا دن ہے) (تغابن:9)

(پس جو کوئی ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ بھی اس کی نظروں کے سامنے ہوگی، اور اپنی چھوٹی سے چھوٹی برائی بھی دیکھ لے گا۔'' (الزلزال:7-8)

جب مستقبل کے اندیشوں اور خطروں سے زندگی غمناک ہو اور حال کی مصروفیتیں اس کو دم لینے کی مہلت نہ دیں تو کس طرح اپنے ماضی کے دریچوں میں جھانک کر دیکھے کہ اس نے کیا حاصل کیا؟ لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے تو شاید احسان ناشناسی کی مجرم گردانی جائے اور کچھ ایسا سرمایہ اپنے بعد آنے والوں کے لیے روک لینے کا سبب بن جائے اور جو ان کے لیے شاید کسی درجہ میں مفید ہو سکے۔ یہی وہ احساس ہے جس نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ ماضی کے اوراق الٹ کر یہ بتاؤں کہ میں نے اپنی زندگی کے اس دور میں کیا حاصل کیا جو جمعیت کے ساتھ گزرا۔

☆☆☆☆☆

کتنی حسین اور دلکش ہے ان دنوں کی کہانی جب ہم نے خدا کی رضا کے راستے پر اپنے سفر کا آغاز کیا اور جادہ اطاعت پر گامزن ہوئے اور پھر..... جب ہم اپنے ایمان میں پختہ تر ہوتے چلے گئے اور ہماری زندگیاں ہمارے عزائم کا آئینہ دار بنتی چلی گئیں، یہاں تک کہ بالآخر خدا تنے ہم کو اس بات کی توفیق دی کہ جس سے بہتر بات کی تمنا اس جسد خاکی میں پوشیدہ کوئی روح کر ہی نہیں سکتی، اور جس سے زیادہ قیمتی دولت کی انسانی آرزو قلب میں آ ہی نہیں سکتی۔ یعنی یہ کہ اس نے ہمارے دلوں کو دعوت اسلامی کے لیے کھول دیا اور ہمیں انبیاء کرام کے نقش پا پر چلنے کے بارے

میں پوری طرح مطمئن کر دیا۔ ہمارے سینوں کو اس دنیا میں اپنی وفاداری کی خاطر جسم و جان کی ساری قوتیں نذر کر دینے کی گرم گرم امنگوں اور ولولوں سے معمور کیا اور آنے والی زندگی میں رضا کے حصول پر مطمئن ہو جانے کی ٹھنڈک بخشی اور ہماری نگاہوں کو اتنی بلندی اور وسعت بخشی کہ وہ اس دنیا کے چند ٹکڑوں سے اوپر اٹھ کر اس جنت کی تلاش میں سرگرداں ہو سکیں جس کی وسعت میں زمین و آسمان سما جائیں اور اس مغفرت کو طلب کر سکیں جو زمین و آسمان کے برابر گناہوں پر بھی حاوی ہو جائے۔ یہی اس دور کا سب سے بڑا عطیہ ہے جو میں نے جمعیت کے ساتھ گزارا اور حقیقت یہ ہے کہ بس خدا ہی کا فضل و کرم تھا ورنہ

(یہ ہمارے بس میں نہ تھا کہ ہدایت پا جاتے، اگر اللہ نے ہی ہم کو اس راستے پر نہ ڈالا ہوتا۔ (الاعراف: ۴۳)

☆☆☆☆☆

اس ادعائے ایمان و ہدایت کی پشت پر نہ کوئی فخر ہے نہ کبر، نہ بڑائی نفس کا احساس ہے نہ اتقائے نفس پر زور، نہ اس سے صالحیت ثابت ہے اور نہ آخرت میں نجات، حقیقت یہ ہے کہ ایمان و ہدایت کی نعمت کے صحیح احساس کے دامن میں تو شکستگی و درماندگی کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے اس کے جلو میں خامیوں اور کوتاہیوں کے احساس کا ایک لشکر ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں اعتراف تقصیر و گناہ کا ایک طوفان امنڈتا ہے اور دل پکار اٹھتا ہے کہ

ربنا انا سمعنا منادیا ینادی للایمان ان امنوا بربکم فامنا، ربنا فاغفرلنا ذنوبنا وکفرعنا سیئاتنا وتوفنا مع الابرار (اے ہمارے مالک! ہم نے ایک پکارنے والے کو یہ پکارتے سنا کہ اپنے مالک پر ایمان لے آؤ پس (یہ تیری توفیق تھی کہ ہم ایمان لے آئے۔ اے مالک اب اس ایمان کے بعد ہم سے گناہ ہوں وہ معاف کر دے اور ہمارا انجام ان لوگوں کے ساتھ کر، جو واقعی نیک تھے۔ (یعنی اپنے دعویٰ ایمان میں صادق)

☆☆☆☆☆

جو کچھ پایا وہ بس یہ تھا کہ خدا نے دین کے صحیح تقاضے سمجھا دیئے اور ان کو مان لینے کی توفیق عطا کی اور اسی کا نام ہے ہدایت، کراچی میں جن افراد نے اسلامی جمعیت طلبہ کی تاسیس کی، میں بھی ان میں شامل تھا اور اس کے لیے کام کرنے کا جذبہ بھی۔لیکن دعوت اسلامی کی روح اس طرح بے نقاب نہ ہوئی تھی۔اس کے صحیح مقاصد اس طرح نہ کھلے تھے اس کے خط وخال اس طرح واضح نہ ہوئے تھے، اس کے مزاج کے ساتھ مزاج اس طرح ہم آہنگ نہ ہوا تھا اس کے حسن و جمال پر دل اس طرح فریفتہ نہ ہوا تھا اور اس کے اصل نصب العین آخرت میں اللہ کی رضا اور اس کی جنت کی طلب اور اس کی جہنم کے ڈر پر نگاہیں اس طرح نہ جمی تھیں، جس طرح یہ سب جمعیت کے چار سالہ دور میں ہوا۔

☆☆☆☆☆

گناہوں کی آلودگیوں سے وقت بھی گرانبار تھا اور اب بھی اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں۔غفلت کا شکار اس وقت بھی ہوتے تھے اور اب بھی ہوتے ہیں۔خدا کی نافرمانیاں اور اس سے بے نیازیاں اس وقت بھی سرزد ہوتی تھیں اور اب بھی ہوتی ہیں۔عہد کے باوجود اپنا سب کچھ خدا کے راستے میں پیش کر دینے میں جب بھی کمی کر جاتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں۔ لیکن جو چیز پالی وہ یہ تھی کہ جس دروازہ پر ایک دفعہ بیٹھ گئے اب اس سے اٹھنے کو دل نہیں چاہتا جس راستے پر نکل کھڑے ہوئے اب اس سے لوٹ جانے کا خیال نہیں آتا۔جس چوکھٹ پر سر رکھ دیا، اب وہاں سے ہٹانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور یہ کیفیت دور جمعیت میں ہی پیدا ہوئی اور یہی خدا کی اب تک سب سے بڑی نعمت ہے اور اس کے ہی چھن جانے کا خطرہ سب سے زیادہ ستاتا ہے اور اس کے لیے خدا سے فریاد کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

''اے مالک! ایک دفعہ ہدایت کے راستے پر لگا دینے کے بعد اب ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر اور ہم کو اپنی رحمت عطا کر، تو ہی عطا کرنے والا ہے۔'' (آل عمران:۸)

اس ہدایت پر روح کو اطمینان کی ٹھنڈک بخشنے میں جمعیت کی زندگی کی نامعلوم کتنی کروٹیں اور کتنے پہلو شریک ہیں، اس میں ان دنوں کی تپش بھی شریک ہے جب ہم پیدل، سائیکلوں پر اور بسوں میں مارے مارے پھرتے تھے اور کالجوں اسکولوں میں گھومتے تھے، محلوں کی خاک چھانتے تھے، کبھی خدا کا دین سمجھنے سمجھانے کے لیے، کبھی دوسروں کو خدا کی طرف بلانے کے لیے، کبھی باطل سے معرکے لڑنے کے لیے، کبھی اپنے بھائیوں سے محبت کے تعلقات استوار کرنے کے لیے اور کبھی جمعیت کے لیے پیسے جمع کرنے کے لیے اور اس میں ان شبوں کا گداز بھی شامل ہے جب ہم مسجدوں میں جمع ہوتے تھے، خدا کو یاد کرنے کے لیے، قرآن پڑھنے کے لیے اور آخری شب وہ آہ سحر گاہی کا لطف لینے کے لیے، جب گھروں میں بیٹھ کر راتیں آنکھوں میں کاٹ دیتے تھے۔ تحریک اسلامی کے لیے حال کے منصوبے بنانے کے لیے اور مستقبل کے افکار و مسائل پر گفتگو کے لیے حال کے منصوبے بنانے کے لیے اور مستقبل کے افکار و مسائل پر گفتگو کے لیے جب راستوں پر اور گزرگاہوں پر کھڑے ہوتے تھے۔ تو گردوپیش کی دنیا سے بے خبر ہو کر خدا کے لیے کام کرنے کا عہد تازہ کرتے تھے، ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس کے راستے پر چلنے کا عزم تازہ کرتے تھے۔

اور اس میں ان لمحات کا سوز بھی شامل ہے جب خدا کے دین کے لیے شہید ہو جانے کی تمنائیں دلوں میں کروٹیں لیتی تھی اور زبان سے ٹپک جاتی تھیں تاکہ جنت تک پہنچنے کا شارٹ کٹ مل جائے۔ پھر اس میں قرآن و حدیث اور سیرت و لٹریچر کے اس مطالعہ کا بھی حصہ ہے جس کے مواقع اس جمعیتی زندگی میں میسر آئے اور سب سے بڑھ کر اخوت و محبت کی اس فضا نے کام کیا جس میں ہر فرد دوسرے فرد کا بھائی تھا بلکہ بھائی سے بڑھ کر اور سب کے سب جسد واحد ہو گئے تھے۔ یہی اس دور کی خصوصیات تھیں۔ دنوں کی تپش، شبوں کا گداز، علم کے مواقع اخوت کی فضا اور جہاد کی سرگرمیاں، جو آج بھی یاد آتی ہی تو دل میں کسک پیدا کر جاتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

اس نعمت کا ذکر ہمیشہ کیا ہے اور اس وقت بھی کر رہا ہوں جب آب خنک پر شکر الٰہی کی ہدایت ہے اس لیے کہ وہ رگوں کو ٹھنک بخشتا ہے، تو ہدایت کی اس بارش پر شکر اور تحدیث نعمت سے زبان کیوں قاصر رہ جائے جس نے روح کو سیراب کیا۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو ہدایت پا جانے کے بعد بھی اس نعمت کے صحیح ادراک سے قاصر رہ جاتے ہیں اور ان کے لیے آگے بڑھنے کے کتنے ہی دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ یہ درس بھی اسی زمانے میں سیکھا کہ جب شکر کے لیے خدا کی اعانت طلب کرنے کی تعلیم ہے۔ تو اس عظیم ترین نعمت کے بعد مزید پانے کا راستہ شکر کا ہی ہے۔ اگر تم شکر کا راستہ اختیار کرو گے تو میں تم کو اور زیادہ عطا کروں گا۔ (ابراہیم)

پھر یہی وہ دور تھا جب علم و تجربہ دونوں سے یہ بات حاصل ہوئی کہ دعوت اسلامی کے کام میں پورا اعتماد اور بھروسہ صرف خدا پر ہونا چاہیے۔ جب ہم اپنی آنکھوں سے یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر ہدایت کا دروازہ کھول دیا تو اس لیے نہیں کھولا کہ ہم ٹھوکریں کھا کھا کر گریں اور واپس لوٹ جائیں۔ جب اس نے ہدایت دی تو اس راستہ پر چلانا بھی اس کی ذمے ہے اور یہ بڑی حماقت ہوگی کہ ہم اس معاملہ میں اس پر بھروسہ نہ کریں۔

(اور ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہم اللہ پر بھروسہ نہ کریں۔ جبکہ (ہم دیکھ رہے ہیں کہ) اس نے ہم کو ہدایتکے راستے پر لگا دیا ہے۔ (ابراہیم)

جب ہم نے ہدایتکی قدر کی اور اس کی ناشکری سے بچنے کے لیے کوشش کرتے رہے اور اسی پر بھروسہ کیا تو ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ ان شرائط کے ساتھ جب بھی اور جس لمحہ بھی کوئی خدا کے راستے پر سفر کرے تو وہ اس کے لیے مزید راہیں کھولتا چلا جاتا ہے جس کا اس نے وعدہ کیا ہے۔

جو لوگ ہمارے لیے کوشش کی انتہا کر دیں ہم ان کو اپنے راستے کی ضرور ہدایت دیتے ہیں۔ (العنکبوت:۲۹)

یہ وہ دور تھا جب خدا نے ہم کو ان وسائل و ذرائع سے بھی نوازا جو ہدایت کا راستہ طے کرنے کے لیے ضروری تھا۔ اس کے لیے ہم کو سمجھ بوجھ عنایت کی۔ اسلام کے مزاج کی صحیح فہم

عطا کی، کتاب وسنت کے سرچشموں تک پہنچایا۔ معاملات کو سمجھنے کی صلاحیت بخشی، زمانے کے حالات سے آگاہ کیا، خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کیا، خفیہ استعداد کو ابھارا، جس کی ضرورت پڑی وہ عطا کر دی تھی، اس کو نکھار دیا، لکھنا اور بولنا سکھایا، ملنا جلنا سکھایا، دلوں کو آپس میں جوڑ دیا، اخوت ومحبت کی نعمت سے سرفراز کیا۔ پیچھے چلنا بھی بتایا اور دوسروں کو ساتھ لے کر چلنا بھی سکھایا۔ جماعتی اخلاق کی تعلیم دی، کام کرنے کی تدبیریں سمجھائیں، آگے بڑھنے کے راستے کھول دیئے۔ جمعیت کی زندگی کی ایک سب سے بڑی خصوصیت شاید یہ تھی کہ یہ عمر کا وہ دور تھا جب انسان کو خود ذمہ داری کی بھٹی میں جھونک کر تپا سکتا ہے اور بنا سکتا ہے۔ یہ عمر کا سب سے بہترین اور اس مقصد کے لیے سب سے موزوں حصہ تھا جب ہم نے اپنے سر وہ ذمہ داری لے لی، جو آسمان وزمین اور پہاڑ بھی نہ اٹھا سکے اور پھر خدا نے اس ذمہ داری کا صحیح احساس دے دیا۔ بس پھر ہم تھے اور یہ بھٹی۔ ہمارے سامنے ایک نصب العین تھا اور ایک راستہ۔ اس کے لیے جن جن سانچوں کی ضرورت پڑتی، وہ ہم کو خود ڈھالنا ہوتے، جس صلاحیت کی ضرورت ہوتی وہ ہم کو اپنے اندر سے لانا ہوتی، جس چیز کی ضرورت ہوتی، اس کو پیدا کرنے کی فکر ہم کو خود کرنا پڑتی۔ جن راستوں پر چلنا ہوتا وہ ہم کو خود آگے بڑھکر کھولنا ہوتے چنانچہ شکر، احساس ذمہ داری اور خود کرنے کے جذبے کی اس بھٹی نے ہم کو سنوار دیا، جلا دے دی گویا مس خام کو کندن بنا دیا۔ ریت کے حقیر ذرے چمک اٹھے۔

☆☆☆☆☆

اس دور کی ان نعمتوں میں سے میں نے کیا پایا؟

قرآن خدا کی کتاب ہے اور خدا کے دین کی علمبرداری کرنے والوں کی سب سے بڑی ضرورت اس کا دھندلا احساس تو تھا لیکن نہ اس سے قربت نصیب تھی، نہ اس کے لیے شوق، نہ اس کو سمجھنے کی راہیں واضح تھیں، پھر وہ وقت آیا جب کراچی جمعیت نے اسٹڈی سرکلر کا پروگرام شروع کیا اور اس کا جو نصاب تھا اس میں سب سے پہلے سورۃ آل عمران کا آخری رکوع تھا اور مجھے اس کا

درس دینا تھا، مجھے وہ وقت اب تک یاد ہے، اس درس کی تیاری کے لیے ککہ میں نے کیا کچھ نہ کیا۔ پورا لٹریچر کھنگھالا، جو بات جہاں بھی کام کی ملی، نوٹ کرلی، ان کو حسن ترتیب دی، حقیقت توحید کا بڑا حصہ نذر حافظہ کیا اور پھر خدا کا نام لے کر تفسیر بالرائے کی غلط تعبیرات سے دھوکہ کھائے بغیر دعوتی رنگ دینے کے لیے اور نظم قائم کرنے کے لیے اپنی سمجھ بوجھ کو بھی استعمال کیا۔ یہ ایک درس کی تیاری تھی، یا بس یوں کہئے کہ یہ آغاز تھا، پھر خدا اس معاملہ میں بہت سی راہیں کھولتا چلا گیا۔ جن کا شکر ادا کرنے سے میری زبان عاجز ہے سب سے بڑا قدم اس وقت اٹھا جب جمعیت کا ناظم اعلیٰ منتخب ہونے کے فوراً بعد ہی کراچی میں مولانا اصلاحی کے درس قرآن میں شرکت کی، اس وقت ذمہ داری کا جو احساس تھا اس نے پروگرام کو میرے لیے نافع ترین کر دیا اور اب تک میں اس کا احسان تسلیم کرتا ہوں۔ کتاب الٰہی کی یہ سمجھ بوجھ جس کا ارتقاء جمعیت کے اجتماعات تربیتی پروگراموں اور شب بیداریوں میں ہوتا گیا۔ میری زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔

☆☆☆☆☆

اس زمانے کی ایک کیفیت اب تک یاد ہے جس نے بڑی مدد دی، جمعیت کے پروگرام کے لیے جب ضرورت سامنے ہوتی تو احساس ذمہ داری کے ساتھ یہ چیز بھی ذہن پر طاری ہوتی کہ جو کام کریں اس کا حق ادا کریں۔ اپنی حد تک اس کو بہترین طریقے پر کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔ یہ جہاں نوجوانی کی عمر کا تقاضہ تھا وہیں جمعیتی زندگی کا ماحول بھی اس کے لیے مہمیز کا کام کرتا تھا۔ یہ ایک ایسا ماحول تھا جہاں پوری بے تکلفی، محنت اور اعتماد سے تعریف بھی ہوتی تھی، داد بھی دی جاتی تھی، تنقیدیں بھی کی جاتی تھیں، پسند و ناپسند کا اظہار بھی کیا جاتا تھا اور کھرے صاف مشورے بھی دیئے جاتے تھے۔ کتنے کارکن ہیں جن کی صلاحیتیں صرف اس لیے ٹھٹھر کر رہ جاتی ہیں کہ جب ان کو کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو وہ اس کا حق ادا کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور ان کے رفقاء نفس شکنی کے غلط زعم میں تعریف سے اجتناب کر جاتے ہیں یا مروت کے غلط جذبے میں تنقید کو سینے میں دفن کر دیتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

جمعیت کی ضروریات میں جو تقسیم کار تھی اس نے مجھے دینی علوم کے حصول کے راستے پر آگے بڑھایا اور حدیث، لٹریچر اور سیرت کے مطالعہ کے دروازے کھول دیئے۔ لٹریچر کا بیشتر حصہ تقریروں کی خاطر ذہن نشین کیا اور اچھے اچھے حصے نوک زبان کر لیے۔ حدیث تو قرآن سمجھنے کے لیے اور تحریک کے معاملات چلانے کے لیے ناگزیر تھی ہی، لیکن یہ سیرت کا دائرہ تھا جہاں میں نے خصوصیت سے کچھ حاصل کیا۔ ہاکس بے پر کراچی جمعیت کی پہلی دو روزہ تربیت گاہ میں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانیوں پر پروگرام کیا، یہ نقطہ آغاز تھا جس نے مطالعہ سیرت کی طرف راغب کیا اور جس کا چسکا جب ایک دفعہ لگا تو آج تک نہ چھوٹا۔ پھر تو جمعیت نے کئی مواقع فراہم کیے۔ اجتماعات میں مجددین کرام کی سیرتوں پر تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا اور اس کی خاطر میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز سے لے کر سید احمد شہید تک سب کی زندگیوں کو پڑھ ڈالا۔ پھر غزوات پر ایک سلسلہ شروع ہوا اور اس کی خاطر مطالعہ جہاد کی اسپرٹ تازہ ہوئی۔ اس کے بعد تو سیرت کے واقعات قرآن، حدیث، تقریر سب کا جزو بن گئے۔ سیرت کو پڑھ کر لطف لینے کی اور اس کو بیان کرنے کی لذت خدا نے ایسی دی کہ آج بھی دل کو حرارت بخشنے والے لمحات وہی ہوتے ہیں جب روح کاغذ کی کشتی پر سوار ہو کر سلف صالحین کی صحبت میں پہنچ جاتی ہے۔

مطالعہ میں زور تو ہمیشہ اس لٹریچر پر رہا جو اس دور میں ہمارے ملک کے سب سے بڑی داعی اسلام نے پیش کیا اور حق یہ ہے کہ دین کے صحیح مزاج کی فہم اور دین کے لیے جدوجہد کا جذبہ، یہ دونوں قیمتی چیزیں اسی لٹریچر سے ملیں، لیکن شاید جمعیتی زندگی کا ہی فیض تھا کہ مطالعہ میں کبھی تخصیص نہ کی، جو چیز پسند آئی پڑھ لی، جو مزاج کے سانچے میں ڈھل گئی، اختیار کر لی، جو کانوں کو بھلی لگی یاد کر لی۔ اس طرح نہ صرف زبان منجھ گئی بلکہ نگاہ میں وسعت اور طرز عمل میں رواداری پیدا ہوئی۔ ہر معاملہ کے مختلف پہلو سامنے رہے، دوسروں کی مشکلات اور ان کے طرز عمل کے اسباب

سمجھتا رہا اور بہت سے ایسے موتی جو پتھروں کے ڈھیر میں چھپے رہتے ہیں چن لیے۔

لکھنے والے تو دو چار تھے لیکن جمعیت کو بولنے والوں کی سخت ضرورت تھی۔ بغیر اچھا بولنے والوں ک نہ دعوت ہی پھیل سکتی تھی، نہ تربیت کا کام ہی ہوسکتا تھا۔ یہ دعوت اسلامی کا ہی فیض تھا کہ اس نے مجھ جیسے گونگے اور شرمیلے انسان کو بولنا سکھا دیا۔ وہ آدمی جو کالج میں چار طالب علموں کے درمیان کھڑے ہوکر بات کرتا تو اس کے پسینے چھوٹتے اور ٹانگیں لرزتیں، ایک وقت اس قابل ہوسکا کہ اپنے کالج کے اسٹیج پر کھڑا ہوکر فرسٹ پرائز حاصل کر سکے۔ ان دو منازل کے بیچ کا پورا ارتقاء جمعیت کی آغوش میں ہوا، شروع میں مضمون نقل کر کے پڑھے، پہلے بیٹھ کر اس لیے کہ ٹانگیں کانپتی تھیں، پھر کھڑے ہوکے پھر لٹریچر یاد کر کے بولنا شروع کیا اور اس اہ میں ''مقرر بناؤ اور بگاڑ'' کے فقرے بھی سنے۔ پھر ایک دن وہ آیا جب اردو کالج میں جمعیت نے کراچی کے کالجوں اور اسکولوں کے اساتذہ کو ایک دعوت پر جمع کیا اور یہ ذمہ داری میرے سپرد کی کہ میں ان سے خطاب کروں۔ یہ وہ دن تھا جب ہمارے مشفق استاد پروفیسر جلیل صاحب نے بغل گیر ہوکر تقریر کر سکنے کی صلاحیت پر یوں صاد کیا'' مجھے تو خوشی اس بات کی ہے کہ گونگا آدمی بول رہا ہے اور خوب بول رہا ہے۔'' اس کے بعد خدا کے فضل سے بکثرت بولا اور یہ صلاحیت پروان چڑھتی گئی، یہاں بھی ان بھائیوں نے اپنا حصہ ادا کیا جو محنت کا حق ادا کرنے کے لیے تعریف کرنے سے بھی نہ ہچکچائے اور صلاحت کو جلا دینے کے لیے تنقید اور مشوروں میں بھی بخیل نہ ثابت ہوئے۔

لکھنے والے کیونکہ دوسرے موجود تھے، اس لیے اس کی ضرورت کبھی محسوس نہ کی کہ اس راہ میں آگے بڑھوں اور طبیعت کے موانعات دور کروں۔ اگرچہ محبت کرنے والے رفقاء اس کے لیے برابر اصرار کرتے رہے۔ پھر بھی اگر کچھ لکھا تو وہ جمعیت نے ہی لکھوایا۔ سیرت ائمہ ربعہ، کا مختصر کتابچہ اور اس کے بعد ''تحریک اسلامی میں کارکنوں کے باہمی تعلقات'' جمعیت کی ضرورت کے تحت لکھے گئے۔ اصل بات یہ ہے کہ تقریر تو انسانوں کی حد تک فضا میں تحلیل ہوجاتی ہے، تحریر سلامت رہتی ہے اور طبیعت میں ہر کام بہترین طریقہ سے کرنے کا جذبہ ہمیشہ اس بات کا داعی رہا

کہ لکھوں تو ایسی چیز لکھوں جس کی اپنی کوئی قدر و قیمت ہو اور یہ بڑا مشکل کام ہے۔

☆☆☆☆☆

انسانوں کو سمجھنا اور ان سے صحیح بنیادوں پر معاملہ کرنا ایک عظیم صلاحت ہے۔ اس میں سے تھوڑا بہت جو حصہ ملا ہے، وہ زیادہ تو دور جمعیت ہی میں ملا ہے یہ صلاحیت تحریک کے ساتھ چلنے والوں اور اس کے چلانے والوں کے لیے ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ تحریک انسانوں سے بحث کرتی ہے۔ انسان ہی اس کی دعوت کا ہدف ہیں اور انسانوں پر ہی وہ مشتمل ہوتی ہے۔ جمعیت کی زندگی میں اس سلسلہ کے بڑے تجربات حاصل ہوئے اس کی ایک وجہ تو وہی تھی کہ جو انسانی مسائل اٹھتے، ان کو سمجھ بوجھکر ہمیں ہی حل کرنا ہوتا۔ لیکن زیادہ بڑی وجہ یہ تھی کہ جمعیت میں ان انسانوں سے سابقہ پیش آتا ہے جو نوجوانی یا بلوغ کے اسٹیج پر ہوتے ہیں اور یہ زمانہ بھی عجیب زمانہ ہوتا ہے، ہنگاموں اور تبدیلیوں سے بھرپور، الجھنوں اور نزاکتوں سے لبریز، عمر کے باقی حصے میں Patterns بن جاتے ہیں لیکن اس عمر میں کوئی لگا بندھا ضابطہ نہیں ہوتا جس کے تحت افراد کے ردعمل کا اندازہ کیا جاسکتا، جو نفسیاتی اور روحانی مسائل پیدا ہوتے ہیں ان کی نظیر بعد میں نہیں ملتی، اس دور میں جن نت نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑا اور ان کو حل کرنے کی کوشش میں جو کچھ حاصل کیا وہ ہمیشہ کے لیے Asset (اثاثہ) رہے گا۔

☆☆☆☆☆

جمعیت کے دور میں ایک بڑی قیمتی چیز جو حاصل کی وہ اخوت و محبت کی نعمت ہے۔ اس دور میں جو اخوت و محبت کی فضا تھی، دل آج تک اس کو ترستا ہے۔ اس میں افراط و تفریط بھی ہوئی ہوگی اور نفس نے فریب بھی دیئے ہوں گے لیکن بحیثیت مجموعی خالصتاً اللہ کے لیے محبت اور دکھ درد میں شرکت کی۔ اسی پاکیزہ اور حسین و جمیل دنیا تھی جو سیرت و کردار کی تعمیر میں سب سے زیادہ موثر رہی۔ اس کی کشش نے نامعلوم کتنوں کو کھینچا اور کتنوں کو جذب کرلیا، اس کی کشش سے اچھے اچھے سخت دل مسخر ہو گئے۔ ایسی فضا نے محبت کرنا بھی سکھایا اور دوسروں کا دل جیتنا بھی۔ یہ پورا ماحول

بڑی حد تک کارکنوں کے باہمی تعلقات کے سلسلے میں قرآن وحدیث کی مثبت ہدایات کا ایک آئینہ تھا یہ محبت کرنے اور دل جیتنے کی صلاحیت اور یہ ماحول جہاں دعوت اسلامی کا ایک بڑا انعام ہے سب کے لیے، وہاں ان لوگوں کے لیے بالکل ناگزیر ہے جو تحریک اسلامی میں آگے چل رہے ہوں۔ اس کا درس بھی ایک جمعیتی بھائی نے دیا تھا۔ جب انہوں نے میری کسی بے رخی اور لاپروائی پر ایک مختصر سے خط میں اقبال کے دو شعر میری نذر کیے:

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ میر کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی

☆☆☆☆☆

نگہ بلند، سخن دلنواز جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

شعر مجھے اکثر یاد نہیں رہتے لیکن صحیح یا غلط، یہ دونوں کبھی نہ بھولے۔ اس کے بعد شعوری طور پر میرا ہر قدم اسی طرح اٹھا ہے کہ میں لوگوں کے دل موہ سکوں ان سے میٹھی بات کر سکوں، اکے ساتھ رافت ورحمت سے پیش آؤں اور قرآن وحدیث کے مطالعہ نے اس مزاج کو پختہ کر دیا۔

''بے شک جو رسول تمہارے اپنے اندر سے تمہارے پاس آیا ہے اس پر ہر وہ چیز بھاری ہے جو تمہارے لیے تکلیف دہ ہو اور تمہاری بھلائی کے لیے اس کی فکر حرص تک پہنچ گئی ہے اور ایمان لانے والوں کے حق میں وہ سرتاپا رحمت وشفقت کا مجسمہ ہے۔''

''اور پس یہ خدا کی ہی رحمت ہے کہ تم ان پر نرم ہو، اگر تم تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے چاروں طرف سے بھاگ کھڑے ہوتے۔

داستان طویل سے طویل تر ہوتی چلی جا رہی ہے اور شاید سب اہم باتوں کی یاد تازہ ہو چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا حال اس کا ماضی ترتیب دیتا ہے، میں آج جو کچھ ہوں اس میں بڑا حصہ اس کا ہے کہ کل کیا تھا۔ جمعیت کا یہ دور زندگی کا نچوڑ اور حاصل تھا۔ میں اس کو اب بھی

اپنی عمر کا سب سے زیادہ درخشاں اور تاباں حصہ شمار کرتا ہوں۔ اگرچہ یہ صرف دن تھے جو بیت گئے، لیکن ساتھ ہی ساتھ ذہن و دماغ اور قلب و روح پر اپنے ان مٹ اور لافانی نقوش اور اثرات چھوڑ گئے۔ یہی وہ اثرات ونقوش ہیں جو کبھی خون بن کر رگوں میں دوڑتے پھرتے ہیں، کبھی آنسو بن کر آنکھوں سے ٹپکتے ہیں، کبھی دل کو گرماتے ہیں، کبھی روح کو تڑپاتے ہیں، کبھی سینے میں نت نئے ولولوں اور امنگوں کے طوفان بن کر نمودار ہوتے ہیں اور کبھی عمل کی دنیا میں تلاطم برپا کر دیتے ہیں، کبھی ہاتھ بن کر خدا کے دین کا جھنڈا اٹھاتے ہیں اور کبھی پاؤں بن کر بازوؤں میں سما جاتے ہیں اور کبھی نگاہیں بنکر اس جنت کی تلاش میں کھو جاتے ہیں جس کی وسعت میں زمین و آسمان سما جائیں۔ کبھی دل میں ندامت وحسرت کا محشر برپا کر دیتے ہیں اور کبھی تقصیر وکوتاہی اور گناہ کے احساس کی شکستگی بن جاتے ہیں۔ کبھی سنتری و پہرہ دار بن جاتے ہیں اور جب قدم جادہ اطاعت سے ڈگمگانے لگیں تو ٹوک دیتے ہیں اور کبھی اسرار نہاں کے رازداں بن کر راہ کی حدود اور منازل کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ماضی سے یہ دولت لے کر حال کی دنیام یں قدم رکھا اور زندگی اسی سرمایہ کے بل پر سفر کرتی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا جب وہ مستقبل کے دروازے پر دستک دے گی اور اس کے لیے دروازہ کھول دیا جائے گا۔ اس وقت اس کے جسم کی قوتیں سلب ہو جائیں گی۔ پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گی (اور پھر اس کو ایک بڑا راستہ طے کرنا ہوگا) اپنے رب کی طرف کا راستہ۔ (القیمۃ ۲۹-۳۰)

دراصل ہم اس بات کے امیدوار ہیں اور متوقع ہیں کہ ہم اس سرمایہ کے بل پر یہ سفر بھی طے کر سکیں گے۔ یہ سفر طے نہ ہو سکا تو سب باطل ہی باطل ہے، یا راکھ کا ایک ڈھیر۔ لیکن جس مالک کی رحمتیں سر کی آنکھوں سے دکھائی دے رہی ہوں، اس سے مایوس کیوں ہوں۔

''بولے ہم تو پہلے جب اپنے ساتھیوں اور گھر والوں میں رہتے تھے تو خدا سے ڈرتے رہتے تھے پس اللہ نے ہمارے اوپر احسان فرمایا اور ہم کو جھلسنے والی ہوا کے عذاب سے بچا دیا،

ہم تو پہلے بھی اسی کو پکارتے تھے، بیشک وہ بڑا شفیق اور رحیم ہے۔(الطور ۲۶ تا ۲۸)

خورشید احمد

۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۶ء تک جمعیت کے رکن رہے۔ کراچی جمعیت کی نظامت اور نظامت اعلیٰ (۱۹۵۳ء-۱۹۵۵ء) کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اسٹوڈنٹس وائس، دور طالب علمی میں ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کی یادگار ہے۔

گورنمنٹ کامرس کالج کراچی سے بی اے کیا اور پھر کراچی یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے، ایل ایل بی بھی ہیں اور اسلامک اسٹیڈیز میں ایم اے بھی ہیں۔

مغربی فکر کا بہت اچھا مطالعہ ہے۔ نہ صرف انگریزی بلکہ اردو بھی اچھی لکھتے ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور اس سے زیادہ کے مرتب و مترجم۔ ترتیب وادارت میں خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ کراچی یونیورسٹی میں گریجویشن کے کورس میں اسلامی تعلیمات کے لازمی مضمون کی نصابی کتاب ''اسلامی نظریہ حیات'' آپ ہی نے مرتب کی ہے۔

انگریزی اور اردو دونوں کے اچھے مقرر ہیں۔ تحریک اسلامی کے سرگرم کارکن ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں اسی گناہ کی پاداش میں جیل ہوآئے ہیں۔ ایک علمی وادبی ماہنامے ''چراغ راہ'' کے مدیر اور ادارہ معارف اسلامی کراچی کے معتمد اعلیٰ بھی رہے ہیں۔ کراچی یونیورسٹی میں معاشیات کے استاد رہے اور پھر انگلستان میں اسلامک مشن کے سربراہ بھی۔

اپنے انگلستان کے قیام کے دوران بھی آپ تحریک اسلامی کا کام اوالعزمی اوزگرم جوشی سے کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ یورپ کے کئی ممالک کے دورے کرکے وہاں کے اسلام مشنز کے قیام یا استحکام میں مدد دیتے رہے ہیں۔ کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شریک

ہوئے اور پاکستان کے منصوبہ بندی کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین رہے۔ ان دنوں، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد کے چیئرمین ہیں۔

دوسال پہلے کا ذکر ہے کہ ایک محفل میں مختلف لوگوں کو مختلف موضوعات دے کر ان سے فی البدیہہ، کچھ کہنے کی فرمائش کی گئی۔ ایک پرچہ میری طرف بھی بڑھا دیا گیا جس پر یہ موضوع تحریر تھا۔

''میری شعوری زندگی کا پہلا دن۔''

عنوان پڑھتے ہی میں تنے ایک ذہنی دھچکا سا محسوس کیا۔ میری شعوری زندگی کا پہلا دن! وہ کون سا دن تھا جب شعور کی پہلی کرن میری زندگی میں ابھری تھی؟ وہ دن جب میں نے ماں کو پہچاننا شروع کیا تھا! وہ دن جب میں نے دودھ کی شیشی اور لکڑی کے کھلونوں میں تمیز کی تھی! وہ ن جب ماں کی مسکراہٹ اور خاموش خفگی کا فرق میری سمجھ میں آیا تھا۔ وہ دن جب مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ کرنا اچھا ہے اور یہ برا ہے..... اور میں نے ان معیارات کو قبول کر لیا تھا۔ میرے دل نے کہا نہیں، ان سب سے اور ان جیسے بہت سے دوسرے واقعات سے تیری زندگی میں کون سا فرق واقع ہوا۔ ان سے تو ہر متنفس کو سابقہ پیش آتا ہے۔ جگہ، زمانہ، افراد، اشیاء، بدلی ہوئی ہوتی ہیں، لیکن یہ واقعات سب ہی کو پیش آتے ہیں اور انسان ان سے اس طرح گزر جاتا ہے جس طرح تو اپنے گھر کے سامنے والی سڑک پر سے گزر جاتا ہے، جہاں مجھے کوئی چیز نئی، غیر معمولی اور چونکا دینے والی محسوس نہیں ہوئی۔ ان کو شعور سے کیا واسطہ؟

میں اس سوچ میں غرق تھا کہ میری زندگی کے افق پر شعور کی پہلی صبح کب نمودار ہوئی تھی؟ میرے دل نے فوراً کہا۔ اس دن جب تو نے جمعیت کی رکنیت کا فارم بھرا ہوا تھا۔ شعور اسے نہیں کہتے کہ تم اشیاء کے نام جان جاؤ اور لوگوں کو پہچاننے لگو، یہ احساس تو جانوروں میں بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ شعور نام ہے زندگی کی اصل کو جان لینے کا، اپنی حقیقت کو سمجھ لینے کا، اپنے صحیح مقام کو دریافت کر لینے کا، زندگی کے مقاصد سے آشنا ہو جانے کا، خیر و شر کے معیار سے واقف ہو جانے کا، اپنے

رب کو پالینے کا، یہ ہے شعور کی ابتداء اور یہی ہے اس کی انتہا۔ زندگی کے جس دور میں بھی انسان اس حقیقت کو پالے وہی اس کے دورِ شعور کا آغاز ہے اور جب تک وہ اسے نہ پائے وہ تاریکیوں کا باسی ہے۔ ظلمات فوق ظلمات اسلام زندگی میں نور بن کر داخل ہوتا ہے اس سے پہلے کی زندگی تاریکی اور ظلمت کی زندگی ہوتی ہے اسے شعور سے کیا واسطہ! میری زندگی میں ایمان کے احیاء نور کی طرف مراجعت اور شعور کی بیداری کا یہ عمل اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستگی سے پیدا ہوا۔ اس سے پہلے کی زندگی بڑی حد تک جاہلیت کی زندگی تھی۔

☆☆☆☆☆

میں نے کاغذ کے اس پرزے پر پھر ایک نظر ڈالی اور اب میرا ذہن اس کا جواب دینے کے لیے بالکل تیار تھا۔ ماضی کے دلفریب دھندلکوں میں آغاز شعور کی تلاش کا یہ سارا عمل بس چند سیکنڈ میں پورا ہوگیا۔ دیکھنے والے تو صرف اس تفکر آمیز مسکراہٹ کو دیکھ رہے تھے جو پرچے کے کھولتے ہی میرے چہرے پر نمودار ہوگئی تھی لیکن اس مسکراہٹ کے پردے میں خیالات کا جو طوفان امنڈ رہا تھا اس کی انہیں کوئی خبر نہ تھی۔ چند سیکنڈ کی اوقات ہی کیا ہوتی ہے؟ اتنا وقت تو انسان گلا صاف کرنے میں ہی لے لیتا ہے لیکن میں گلا نہیں صاف کر رہا تھا، ماضی کے غفالوں کو ہٹا کر اس حسین صبح کا پردہ ذہن پر دوبارہ جلوہ گر کر رہا تھا جب میں نے جمعیت کی رکنیت کا فارم بھرا تھا۔

وہ دن بھی بڑا عجیب تھا، بہت سے بے چین دنوں اور بے قرار راتوں کا نقطہ اتمام، پریشانی کے بہت سے لمحات کا ڈراپ سین، ایک نئے پرامید دور کا آغاز کار!

☆☆☆☆☆

یہ میری طالب علمی کے ابتدائی زمانے کی بات ہے کہ مجھے انگریزی درست کرنے کا شوق ہوا۔ ویسے تو میری انگریزی بری نہیں تھی۔ فرسٹ کلاس نمبر اسکول کے زمانے ہی سے آتے تھے لیکن اخبارات پڑھنے کے شوق نے انگریزی بہتر بنانے کا جذبہ پیدا کیا۔ غالباً مارچ ۱۹۴۹ء

میں کالج کی سوسائٹی کے تحت میں نے ایک مضمون پاکستان کے بجٹ پر پڑھا جسے بہت پسند کیا گیا اور ہمارے معاشیات کے استاد نے اس کی زبان کی خاصی تعریف کی۔ اس مضمون کو (MUSLIM ECONOMIST) (جو اس زمانے میں لاہور سے نکلتا تھا) نے شائع کیا۔ ''تعریف'' اور ''مضمون'' چھپنے نے مہمیز کا کام کیا۔ یہ میرا پہلا مضمون تھا جو کسی ملکی رسالے میں چھپا تھا اور میں اس پر بڑا نازاں تھا۔ ایک عرصے تک میں نے اسے محفوظ رکھا۔ (اب یہ بات چاہے بچکانہ ہی کیوں نہ معلوم ہو لیکن اس وقت اپنی کیفیت تھی یہی)۔

اسی جستجو میں، میں نے پنڈت نہرو کی خودنوشت AUTO BIOGRAPHY کا مطالعہ کیا۔ بلاشبہ پنڈت نہرو کا نام ہندوستان کے انگریزی لکھنے والوں میں سرفہرست آتا ہے۔ اس کی زبان میں جو بانکپن، روانی اور جذباتیت ہے، اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ میں پنڈت جی کی تحریرات کا عاشق ہو گیا اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی ہر کتاب پڑھنے لگا۔ تاریخ عالم کی جھلکیاں (GLIMPSES OF WORLD HISTORY)۔ تلاش ہند (THE DISCOVERY OF INDIA) کا مطالعہ کیا۔ بڑی جستجو سے (SOME RECENT WRITINGS AND SPEACHES) حاصل کی اور پڑھی۔ بڑی تلاش کے بعد (SOVIET RUSSIA) حاصل کی، غرض جو کچھ مل سکا، پڑھا۔ لیکن یہ نہ سوچا کہ زبان کی تلاش میں کچے اور خام ذہن کی مڈبھیڑ کن نئے خیالات و افکار سے کرا رہا ہوں۔ پنڈت نہرو انگریزوں سے بھی اچھی انگریزی لکھتے ہیں، لیکن ان حسین الفاظ میں جو زہر بھرے خیالات پیش کرتے ہیں ان کی جڑیں الحاد اشتراکیت اور قومیت میں اتری ہوئی تھیں۔ الفاظ کے حسین خول میں خیالات کا جو زہر بھرا ہوا تھا وہ برابر مجھ میں سرایت کرتا رہا۔ اسی تلاش و جستجو نے مجھے ایم این رائے سے متعارف کرایا۔ ایم این رائے کا ذکر نہرو کی تحریرات میں پڑھا اور اس کی کتابوں کی تلاش کی۔ (REDICAL HUMNIST) کا خریدار بنا اور اس کی کتابیں آٹھ نو کی تعداد میں پڑھ ڈالیں۔ ایم این رائے کا حملہ زیادہ شدید تھا، مطالعہ بڑھتا گیا۔ جان اسٹورٹ مل کی کتابیں پڑھیں۔ ڈاکٹر واٹسن کو پڑھنے اور سمجھنے کی ناکام

کوشش کی۔ اس سارے مطالعے نے ذہن میں شکوک وشبہات کے بیشمار کانٹے چبھو دیئے جن باتوں پر کبھی غور نہیں کیا تھا وہ سوالیہ نشان بن کر سامنے آ گئیں۔ جن چیزوں کو مسلمات جانا تھا ان پر اعتراضات کی یورش دیکھ کر بے اطمینانی پیدا ہونے لگی۔ نماز اب بھی جاری تھی مگر اب یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ آیا اس کی کوئی افادیت ہے؟ بظاہر خدا اور آخرت پر ایمان تھا اور اس ایمان سے محرومی کو طبیعت کسی قیمت پر گوارا نہیں کرتی تھی لیکن وہ اب معصوم اطمینان اور اندھا یقین بھی باقی نہ تھا جس نے اب تک شکوک وشبہات کو ذہن کے دریچوں کے باہر ہی روک رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے دل و دماغ کو سکون کی دولت میسر تھی۔ یہ زمانہ میرے لیے خاصا کٹھن تھا۔ میرے دماغ کی کیفیت کو سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔ خیالات وتصورات کے نقش بار بار بنتے اور مٹتے تھے اور میری کیفیت یہ تھی۔

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

جس کتاب کو پڑھتا تھا تھوڑی دیر کے لیے اسی پر ایمان لے آتا تھا۔ لیکن یہ ایمان بہت ہی مختصر مدت باقی رہتا۔ میں برابر مٹی کے گھروندے بناتا اور توڑتا رہا۔ میں نے اپنی اس کیفیت کا اپنے ایک دوست سے ذکر کیا اس نے کہا امتحان کے بعد لگ کر دو تحریکات کا مطالعہ کرو کمیونسٹ پارٹی اور جماعت اسلامی انہیں میں سے کوئی تم کو اپیل کریں گی۔ میں نے بات کو ہنسی میں ٹال دیا۔ اس وقت ملا بننے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا۔

میرا یہ ذہنی سفر بڑا عجیب ہے۔ بات ادب وانشاء سے چلی تھی اور جا پھنسا میں افکار و خیالات کے دلدل میں۔ پہلے نگاہ صرف حسین جملوں اور حسین استعمالات کو تلاش کرتی تھی۔ اب دماغ صحیح نظریات اور ذہن سکون اور اطمینان کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ انگریزی درست کرنے کا جنون اب بھی تھا لیکن اس سے بڑھ کر ضرورت اس لٹریچر کی تھی جو دماغ کو مطمئن کر سکے اور ان سوالات کے جوابات دے جو مجھے پریشان کیے ہوئے تھے۔

لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا
جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا

اس ذہنی کیفیت کے ساتھ میں لاہور سے کراچی آیا، غالباً جون ۱۹۴۹ء میں۔ گھر کے باقی لوگ تو پہلے ہی آ چکے تھے۔ میں اپنا تعلیمی سال مکمل کرنے کے لیے لاہور رہ گیا تھا اور اب آیا تھا۔

یہاں گھر کا نقشہ ہی پلٹا ہوا تھا۔ بھائی ضمیر جمعیت سے متاثر ہو چکے تھے۔ میں نے خطبات، تنقیحات اور تفہیمات انہیں کے پاس دیکھیں، وہ ان کتابوں کا برابر مطالعہ کرتے تھے..... اور میں.....اس وقت اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے میں نادم ہوں۔ ان ک یار دو میں ہونے کے سبب انہیں پڑھنے کے لیے کوئی رغبت محسوس نہ کرتا تھا۔ بھائی ضمیر کی اس تبدیلی پر میں قدرے بے چین تھا۔ اس لیے کہ یہ میرے لیے خاصی غیر متوقع تھی۔

ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک دن ہمارے ہی گھر میں جمعیت کا اجتماع ہوا۔ آج تک میں ''جلسہ'' کے لفظ سے آشنا تھا۔ ''میٹنگ'' سے واقف تھا لیکن ''اجتماع'' کیا بلا ہوتی ہے؟ بھائی ضمیر نے دعوت دی کہ تم بھی شرکت کرنا۔ غالباً پہلے ہفتے تو میں نے شرکت نہیں کی، صرف دور سے چند عجیب وغریب لوگوں کی آمد ونشست کو دیکھتا رہا اور اس ماحول اور ان لوگوں میں اپنے کو کچھ بے جوڑ سا محسوس کیا۔ دوسرے ہفتے بھائی ضمیر کے کہنے پر میں نے اجتماع میں شرکت کی۔ اس اجتماع میں درس قرآن مولانا یحییٰ ندوی صاحب نے دیا اور تقریر پروفیسر جلیل الدین صاحب نے کی، جدید یورپ کا فلسفیانہ پس منظر۔ جلیل صاحب کی تقریر سے میں کافی متاثر ہوا۔

پھر جب معلوم ہوا کہ جلیل صاحب انگریزی کے پروفیسر ہیں تو میری دلچسپی ان سے بڑھ گئی اور ان کی تقاریر کی خاطر میں جمعیت کے اجتماعات میں آنے لگا۔ جلیل صاحب نے پانچ چھ تقاریر کیں اور ان تقاریر میں اتنا مواد آ گیا کہ وہ میرے ذہن کو اپیل کرنے اور میری دلچسپی

بڑھانے کے لیے کافی تھا۔جلیل صاحب نے سب کو کچھ کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیا اور ان میں محمد اس کی (ISLAM AT THE CRAVDAD) اور جوڈ کی (GUIDE TO MODERN THOUGHT) خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور لوگوں نے تو ان کتابو کی طرف خاصی توجہ نہ دی (خصوصیت سے دوسری) لیکن میں نے فوراًان کو خریدا اور بڑے شوق سے پڑھا۔ پہلے جوڈ کی کتاب پڑھی۔میرے ذہن پر عقلیت اور الحاد و مادیت کا جو رعب قائم تھا اسے شدید دھچکا پہنچا۔ مغرب سے ذہنی مرعوبیت کو پارہ پارہ کرنے میں اس کتاب نے بڑا حصہ ادا کیا۔اس کی کتاب نے مجھے تقریباً ہلا دیا۔اس کی زبان کی دلکشی، بیان کا جادو، دلیل کی قوت، یقین اور ولولہ کی فراوانی، مغرب پر دندان شکن حملہ، اسلام کی انقلابی قوتوں کا اثبات و اعتراف اور ایک جرن کے قلم سے! ان تمام چیزوں نے مجھے جھنجوڑ ڈالا۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسد کا ایک ایک جملہ گویا مجھ ہی سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے:

تقلید پہ یورپ کی رضامند ہوا تو
مجھ کو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں

میں نے کتاب کو دوبارہ پڑھا اور پھر اسد کی تحریرات کا عاشق ہو گیا۔''عرفات'' کا اشتہار اسی کتاب میں دیکھا تو پرانے پرچے حاصل کرنے کی کوشش کی۔رباط العلوم الاسلامیہ میں وہ ملے۔وہیں بیٹھ کر حرف حرف پڑھا۔نوٹس لیے اور اچھے اچھے جملے یاد کیے۔جلیل صاحب نے شاید میری ذہنیت کو بھانپ کر مجھے تنقیحات کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔میں نے کتاب کا مطالعہ شروع کیا۔ پہلا مضمون ''ہماری ذہنی غلامی اور اس کے اسباب'' ہی چونکا دینے والا تھا۔مغربی تہذیب کے ارتقاء اس کے مزاج اور اثرات پر جو گفتگو مولانا نے کی تھی اس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

کتاب کے نام کی اجنبیت مضمون کی دل آویزی سے دور ہو گئی۔ مجھے ہرگز توقع نہ تھی کہ کوئی ''مولوی'' ان موضوعات پر لکھ سکتا ہے اور اس خوبی، اس تبحر علمی اور اس تحدی کے ساتھ لکھ سکتا ہے۔مولانا کے بارے میں میرا پہلا تاثر اس مضمون سے قائم ہوا اور میں نے مولانا کو قطب مینار

کی بلندیوں پر پایا۔ جن کو دیکھنے کے لیے مجھے اپنا سر اتنا اٹھانا پڑتا تھا کہ میری ٹوپی گر جاتی تھی۔ میں نے کتاب کو دو ہی دن میں ختم کر ڈالا اور پھر بے چینی کے ساتھ مولانا کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ تفہیمات پڑھی، اسلام اور جاہلیت، دین حق، سلامتی کا راستہ اور خطبات کا مطالعہ کیا۔ اب فی الحقیقت میری خودسری اور زعم کی ٹوپی پیچھے گر چکی تھی۔ میں نے ایک ذہنی شکست محسوس کی۔ ایسی شکست جس میں باطل خیالات کا زعم ٹوٹ چکا تھا، احساس برتری جاتا رہا تھا۔

''اسلام ایک ہاں چل سکتا ہے'' کا واہمہ ہوا ہو چکا تھا، اب تک جس مطالعہ پر ناز تھا اس کا بودا پن واضح ہو چکا تھا، خیالات کے جو گھروندے بنائے تھے، افکار و نظریات کی محفل سجائی تھی، وہ ویران ہو چکی تھی، میں اپنی ساری پونجی ہار چکا تھا لیکن کتنی خوشی تھی مجھے اس شکست پر، کیسی لذت تھی اس شکست میں، کیسا حسن اور کیسی رعنائی تھی اس میں، کس قدر قیمتی تھی یہ شکست اور اب یہ مجھے کتنی عزیز اور پیاری تھی۔ میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ اس شکست نے میری زندگی کا رخ موڑ دیا، اس نے میرے سامنے ایک دوسری ہی دنیا کے دروازے کھول دیئے۔ وہ سارے پردے جو میرے دل اور دماغ پر پڑے ہوئے تھے، ایک ایک کر کے اٹھا دیئے۔ اب میں اپنے اصل قد و قامت کو دیکھ سکتا تھا۔ ایک عاجز انسان کی حیثیت سے، خدا کے عبد کی حیثیت سے، محمدؐ کے غلام کی حیثیت سے اور بڑے ناز کے ساتھ اپنے سے کہتا تھا۔

تجھے اے جگر مبارک یہ شکست فاتحانہ

اسد اور جوڈ نے میرے قدم ہلا دیئے تھے اور مولانا مودودی کی تحریرات نے میرے دماغ میں دماغ کو مسخر کر لیا۔ انہوں نے زمین ہموار کی تھی۔ مولانا نے اس صاف زمین پر ایک فلک بوس عمارت کی تعمیر کر دی تھی۔ لیکن میں ذرا جلد بازی سے نتائج پر پہنچ رہا ہوں، ابھی ایک مرحلہ تو باقی تھا۔

☆☆☆☆☆

ذہنی کش مکش اور اسلام کی بازیافت کا یہ عمل تقریباً سات آٹھ ماہ پر پھیلا ہوا ہے۔ اس

زمانے میں جو دوسرا عمل کارفرما تھا وہ ایک غیر محسوس طریقے سے ایک نئی برادری میں ضم ہو جانا ہے۔ دوست میرے پہلے بھی تھے۔ ہم کلاس طلبہ سے اچھے تعلقات بھی رکھتا تھا م۔ سگے بھائیوں میں جو محبت اور تعلق ہوتا ہے الحمدللہ اس سے بھی میں محروم نہ تھا۔ لیکن اس نئی برادری میں ایک نا قابل بیان قوت تسخیر جاذبیت اور کشش تھی۔ یہ کیفیت صرف ''نا قابل بیان'' ہی نہیں، کم از کم اس وقت ''غیر محسوس'' بھی تھی۔ یہ ماحول بھی عجیب ماحول تھا۔ یہاں ہر ایک کا حال یہ تھا:

ساز دل چھیڑ کے بھی توڑ کے بھی دیکھ لیا
اس میں نغمہ ہی نہیں کوئی محبت کے سوا

میں نے ماں، باپ اور بھائیوں کے دائرہ ک یباہر پہلی مرتبہ اتنی وافر مقدار میں خلوص، محبت، بھائی چارہ، ایک دوسرے کے لیے قربانی اور ایثار کو دیکھا۔ یہاں ہر ایک کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی پورے خلوص کے ساتھ وہی چاہتا بلکہ اس سے بھی خوب تر جو وہ خود اپنے لیے پسند کرتا تھا۔ بھائی ضمیر ستمبر ۱۹۴۹ء میں لندن چلے گئے لیکن رفقائے جمعیت نے مجھے اس طرح اپنے سے وابستہ رکھا اور پھر اپنے میں اس طرح جذب کر لیا کہ میں اپنے کو ان میں سے ایک محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ جمعیت میرے اوپر جادو کی طرح چل گئی۔ میں نے یہ سفر محض ایک تماشائی کی حیثیت سے شروع کیا تھا۔ لیکن میری پوزیشن میں تقریباً ڈرامائی انداز میں تبدیلی واقع ہوئی اور بہت جلد میں اپنے کو یکے از رہروان کارواں محسوس کرنے لگا۔

یہاں اصلاح اور تربیت کا جو طریقہ میں نے دیکھا وہ بے رحمانہ تنقید سے عبارت نہ تھا یہاں ''ہر گام پر چار آنکھیں نگراں، ہر موڑ پر ایک لائسنس طلب'' کی کیفیت بھی نہ تھی بلکہ جو طریقہ میرے معاملے میں اختیار کیا گیا وہ یہ تھا کہ گویا:

تم نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

اس عجیب برادری میں صرف محبت و اخوت ہی نہ تھی۔ ایک دوسرے کی خیر خواہی اور اس

کے لیے ایثار وقربانی بھی تھی۔ یہاں اقتدار کی کوئی کش مکش نہ تھی کسی کو دوسرے سے آگے بڑھنے یا اسے پیچھے دھکیلنے کی ہوس نہ تھی۔ پیٹھ پیچھے کسی کی برائی نہ ہوتی تھی۔ ہر ایک دوسرے کو اس کی خوبیوں سے یاد کرتا تھا۔ ہر شخص کی کمزوریوں کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ مجھے ہرگز یہ خوش گمانی نہیں کہ میری کمزوریوں سے میرے رفقاء واقف نہ تھے لیکن انہوں نے کبھی بھونڈے انداز سے مجھ پر تنقید نہ کی۔ کبھی مجھ سے یہ نہ کہا کہ تو سینما کیوں جاتا ہے؟ کبھی یہ نہیں پوچھا کہ تو نے اتنی نمازیں باجماعت کیوں نہ ادا کیں؟ کبھی میرے لباس پر، میرے شیو پر، میری شوخیوں اور شرارتوں پر، حتی کہ میری تنقیدوں پر اعتراض نہیں کیا، میری غلطیوں تک کو گوارا ہی نہیں کیا بلکہ کبھی کبھی تو ان کا احترام بھی کیا۔ یہی وہ چیز تھی جس نے میری اخلاقی حس کو بیدار کیا۔ جس نے میرے سامنے اصلاح وترقی کا ایک نیا میدان کھول دیا۔ میں نے خود اپنا محاسبہ شروع کیا۔ میں خود اپنا نگراں بن گیا۔ میرے ساتھیوں کی ظرف کی وسعت میری تربیت کا ذریعہ بنی۔ میں نے ایک ایسی دنیا کو تلاش کرلیا جسے پانے کے لیے میری روح بے تاب تھی۔

میرے دل نے دی گواہی
کہ یہی ہے تیری منزل

ایک طرف اسلامی لٹریچر نے میرے ذہن کو مسخر کیا تو دوسری طرف اس نئے ماحول نے مقناطیسی کشش کے ساتھ مجھے اپنی طرف کھینچا۔ یہ تھا وہ عمل جس نے میرے شعور کو بیدار کیا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ فی الحقیقت سوچ سمجھ کر اپنا راستہ طے کیا، اپنے مقام کو پہچانا اور اپنی منزل کو متعین کیا۔ جاہلیت کی زندگی پر ندامت کے آنسو بہائے اور اسلام کی راہ پر چلنے کا عزم کیا۔ خدا کی اس عنایت پر اس کا شکریہ ادا کیا اور جمعیت کی رکنیت کا فارم طلب کیا۔

میں جس وقت رکنیت کا فارم پر کر رہا تھا اور پورے یقین کے ساتھ کلمہ شہادت دوبارہ ادا کر رہا تھا۔ اس وقت زندگی کے سارے واقعات آنکھوں کے سامنے سے اس طرح گزر رہے تھے جیسے پردہ سینما پر فلم۔ میں نے فارم مکمل کیا۔ اپنی زندگی کے ایک باب کو بند کر دیا اور خدا کا نام

لے کر ایک دوسرے باب کا آغاز کیا، یہ تھا شعوری زندگی کا میرا پہلا دن۔

☆☆☆☆☆

زندگی کی یہ دھوپ چھاؤں یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ جمعیت میری سب سے بڑی محسنہ ہے۔ اوروں کے بارے میں تو میں نہیں کہہ سکتا، کسی کو اس نے کچھ دیا ہوگا اور کسی کو کچھ اور.....لیکن میرا تو سب کچھ اسی کا عطیہ ہے۔ میں جو کچھ ہوں جمعیت کی وجہ سے ہوں۔ میری ہر چیز جمعیت کی مرہون منت ہے۔ اس سے پہلے میری زندگی میں نہ ایمان تھا نہ شعور۔ نہ مجھے زندگی کی حقیقت کا پتہ تھا، نہ دنیا میں اپنے صحیح مقام کا احساس، میں اس گیند کی طرح تھا جسے حوادث و واقعات ادھر سے ادھر پھینکتے رہتے تھے اور اسی گردش دوراں کو میں زندگی کی معراج سمجھے ہوئے تھا۔ جمعیت نے مجھے وہ چیز دی جسے میں ''میں'' کہتا ہوں۔ جمعیت سے پہلے میں کچھ نہ تھا اور جمعیت کے بعد میں نے خود اپنے کو دریافت کیا۔ پرانے دیئے بجھ گئے اور اس آفتاب کی روشنی نے پوری زندگی کو جگمگا دیا۔

جمعیت سے وابستہ ہونے کے بعد جو کیفیت میری ہوئی اسے میں اگر بیان کرسکتا ہوں تو غالب کی مدد سے بس اس حد تک کہ

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہوگئیں

اب تک میں محض جانوروں کی طرح زندگی گزار رہا تھا۔ اب مجھے زندگی کے مقاصد کا علم ہوا۔ مجھے احساس ہوا کہ انسان محض درختوں کی مانند نہیں ہے کہ زمین، پانی، فضا سے غذا حاصل کرتا رہے اور آپ سے آپ بڑھتا چلا جائے۔ انسان دریاؤں کی مانند بھی نہیں ہے کہ ہر نشیب کی طرف بہتا چلا جائے۔ انسان کی سب سے بڑی ضرورت زندگی کے مقاصد کا تعین اور ان کے حصول کے لیے ایک مکمل نظام زندگی ہے جب تک کہ یہ حاصل نہ ہو زندگی بے مزہ، بے کیف اور سعی رائیگاں سے زیادہ نہیں۔ اب میری زندگی اس گھوڑے کی مانند نہ تھی جس کا کوئی کھونٹا نہ ہو۔ جس کا کوئی تھان نہ ہو۔ جو ہر سبزہ زار میں منہ مارتا پھر رہا ہو۔ اب میری منزل متعین تھی۔ میں نے

اپنی راہ کو پالیا تھا اور پورے اطمینان قلب کے ساتھ اس پر گامزن تھا۔

☆☆☆☆☆

پھر جمعیت نے میری زندگی کی نہج کو بدلا۔ مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ توفیق حاصل ہوئی کہ منکرات سے دامن کش ہوں اور معروف کے حصول کے لیے کوشاں ہوں۔ میں خیر و شر اور حق و باطل کی اقدار سے آشنا ہوا اور اپنی زندگی کو بدلنے کی جدوجہد میں سرگرم ہو گیا۔ میں اسی خوشی اور مسرت کو بیان نہیں کر سکتا جو ایک ایک برائی کو چھوڑنے سے حاصل ہونے لگی اور وہ احساس ندامت و شرمندگی بھی نا قابل بیان ہے جو ہر کوتاہی اور لغزش پر محسوس ہونے لگی۔ یہ زندگی ایک دوسری ہی زندگی تھی۔ اس میں سوچنے کے انداز، غور و فکر کے زاویئے خوب و ناخوب کے پیمانے بدل رہے تھے۔ پہلے جن باتوں میں دلچسپی تھی اور جن میں گھنٹوں منہمک رہا کرتا تھا، اب ان کا تصور بھی گراں ہو گیا۔ پہلے جن دوستوں کے ساتھ ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا تھا، اب ان کی صحبت کاٹنے لگی۔ اس کے مقابلے میں پہلے جن چیزوں کو سستی اور بے رغبتی کے ساتھ کرتا تھا اب ان کی چاہ پیدا ہو گئی۔ پہلے جو نماز محض عادت تھی، اب عبادت میں تبدیل ہونے لگی۔ پہلے جو روزہ محض ایک رسم تھا اب اس کی معنویت آشکار ہونے لگی، جو لوگ پہلے ''الول جلول'' سے معلوم ہوتے تھے، اب دوستی اور محبت کا مرکز بن گئے، پہلے جو کام عار معلوم ہوتے تھے اب شعار بننے لگے۔ مجھ میں ایک اندرونی انقلاب رونما ہوا اور خدا کا احسان ہے کہ اس نے نیکی اور اطاعت کی زندگی کی طرف بڑھنے کی توفیق دی، آہستہ آہستہ یہ اثرات پوری زندگی پر پھیل گئے۔

جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

جمعیت میں آ کر پہلی مرتبہ میں نے وقت کی قیمت کا احساس کیا، پہلے محض گپ، لطیفہ بازی، ہوٹل گردی اور گھومنے گھامنے میں روزانہ گھنٹوں صرف کر دیا کرتا تھا۔ وقت کو پانی کی طرح بہاتا تھا بلکہ اس سے بھی بیدردی کے ساتھ! یہاں آ کر مجھے وقت کی قیمت کا اندازہ ہوا۔ احساس ہوا کہ مجھے ایک ایک لمحہ کا جواب دینا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ زندگی مختلف اور متنوع

مطالبات سے عبارت ہے یہاں سنجیدہ گفتگو اور ہنسی مذاق، تفکر و تبسم، کام و آرام، محنت و فرصت پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ ان میں کسی کو بھی ختم نہیں ہونا چاہیے۔ زندگی اسی وقت متوازن اور حسین ہو سکتی ہے جب یہ دونوں پہلو موجود ہوں۔ بحیثیت دین، اسلام کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ نہ وہ دنیا میں بالکل گم ہو جانے کی اجازت دیتا ہے اور نہ دنیا کو ترک کر دینے کی۔ نہ وہ جسم کے فطری مطالبات کا انکار کرتا ہے اور نہ ان میں بے جا انہماک کو درست جانتا ہے۔ اس نے جو کارنامہ انجام دیا ہے، وہ یہ کہ فطری مطالبات پر لگام دی دائے اور حدود متعین کر دی ہیں۔ یہاں ہر فطری ضرورت کی تسکین بھی ہے اور ہر بے اعتدال کی تحدید بھی۔

میں نے جمعیت میں آ کر یہ سیکھا کہ وقت کا صحیح استعمال کس طرح ہو سکتا ہے۔ میرے بہت سے ساتھی اس بات پر تعجب کا اظہار کرتے رہتے ہیں کہ تم اتنا کام کیسے کر لیتے ہو اور میرا جواب صرف یہ ہے کہ وقت کی مناسب منصوبہ بندی کر کے پہلے میری تفریح یہ تھی کہ میں مال روڈ پر یا لفنسٹن اسٹریٹ پر گھومتا تھا۔ اب میری تفریح یہ تھی کہ میں اپنے رفقاء سے ملنے کے لیے جاتا تھا۔ پہلے میں دوستوں میں بیٹھ کر گھنٹوں گپ کرتا تھا۔ اب میں اس وقت کے نئے رفقاء کو کوشیکٹ کرنے میں صرف کرنے لگا۔ پہلے میں ناول اور افسانے پڑھتا تھا، اب میں سنجیدہ مطالعہ میں زیادہ وقت صرف کرتا تھا۔ کالج کے خالی پیریڈز میں دوسرے لوگوں سے ملاقاتیں کرتا تھا۔ لائبریری میں رسائل و کتب کا مطالعہ کرنے میں روزانہ تین تین چار چار گھنٹے صرف کرتا تھا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹیانیکا، چیمبرز انسائیکلو پیڈیا اور انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسز سے اپنی دلچسپی کے مضامین پڑھنے میں وقت گزارتا۔ اب میرا جیب خرچ صرف کتابیں اور رسالے خریدنے میں ہی صرف ہوتا تھا۔ رات کے مطالعے کی عادت بھی ڈالی۔ کوشش کرتا کہ دوسرے کام عشاء تک ختم ہو جائیں اور اس کے بعد گھر بیٹھ کر دو تین گھنٹے مطالعہ کروں۔ اسلام کا مطالعہ، علوم جدیدہ کا مطالعہ، دنیا کی مختلف آئیڈیالوجیز کا مطالعہ، میرے مطالعہ کا بہترین دور جمعیت سے وابستگی ہی کا زمانہ ہے۔ پھر وہ زمانہ وہ بھی ہے جب مجھ پر کراچی کی نظامت اور اس کے بعد نظامت اعلیٰ کی

ذمہ داریاں بھی تھیں۔

اسٹوڈنٹس وائس کی ادارت اور پھر اس کے ہر پرچے کے لیے دس بارہ صفحات بھی لکھنا پڑتے تھے۔ صرف کراچی کے تقریباً چالیس ارکان اور ڈیڑھ سو رفقاء سے ذاتی رابطہ بھی رکھنا پڑتا تھا۔ ملاقاتیں، گفتگوئیں (۱)، تقریریں، مشورے، دفتر کی نشستیں یہ سب تھیں۔

☆☆☆☆☆

میری زندگی میں جو کچھ نظم رونما ہوا اور میرے کام میں جس حد تک بھی متضاد مطالبات میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ وہ جمعیت کے زمانے کی تربیت کا نتیجہ ہے اور اسے وقت کی پلاننگ ہی کے ذریعے حاصل کیا گیا ہے۔ ایک مدت سے میں نے اپنے اوپر یہ لازم کر رکھا ہے کہ رات کے سونے سے قبل دو تین منٹ ضرور اس امر کے محاسبہ پر صرف کرتا ہوں کہ آج کا دن کیسا گزرا، میں نے کیا کام کیے، کہاں میرا وقت ضائع ہوا اور کہاں مفید استعمال ہوا، اس ایک چیز یعنی وقت کے صحیح استعمال اور اس کے مستقل محاسبہ نے میری جتنی مدد کی غالباً کسی دوسری چیز نے نہیں کی۔

☆☆☆☆☆

پھر جمعیت میں آکر میں نے صرف اپنے ہی لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی جینا سیکھا۔ اپنی ضرورتیں تو ہر کوئی پوری کرتا ہے اور اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے دوسروں کو نقصان پہنچانا ہر بوالہوس کا شیوہ رہا ہی ہے۔ ایک مسلمان کا طریقہ تو یہ ہے کہ وہ صرف اپنے ہی لیے نہیں بلکہ اپنے بھائی کے لیے بھی خیر کا طالب ہوتا ہے اور اس کے بھلے کے ایثار و قربانی سے کام لیتا ہے۔

نشہ پلا کر گرانا تو سب کو آتا ہے

---

(۱) یہ ہمارے زمانے کی خالص جمعیتی اصطلاح ہے جو غالباً اب تک جمعیت میں رائج ہے۔ اس سے مراد عام گفتگو نہیں بلکہ وہ گفتگو ہے جو ایک ناظم کو مختلف قسم کے مسائل اور الجھنوں پر اپنے رفقاء سیکرنی ہوتی ہے اور جس میں وہ ذاتی اور اجتماعی پیچیدگیوں کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک زمانے میں تو (اچھا آپ گفتگو کریں) کافی معنی خیز جملہ ہو گیا تھا۔

مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

اس احساس کو جس چیز نے سب سے زیادہ پیدا کیا وہ داعیانہ جذبہ ہے۔ جمعیت میں آ کر میں نے سیکھا کہ میری ذمہ داری صرف یہ نہیں کہ خود حق کو جان لوں بلکہ یہ بھی ہے کہ پوری انسانیت تک اس حق کو پہنچاؤں۔ (مسلمان وہ بہترین امت ہے جو انسانیت کی طرف بھیجی گئی ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو)۔ (آل عمران)

دوسروں کے لیے سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ ان کو غلط راستے سے نجات دلائی جائے۔ ان کو جہنم کی آگ سے بچانے کا بندوبست کیا جائے۔ ان تک دین کی دعوت کو پہنچایا جائے اور اسلام کی برکات سے ان کی جھولیاں بھر دی جائیں جو اسلام سے آشنا نہیں ہیں ان کو اس دین کی طرف بلایا جائے اور جو اسلام کے دعویدار ہیں انہیں اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی دعوت دی جائے۔ کیا قرآن یہ نہیں کہتا کہ (اے وہ جو ایمان لائے ہو، ایمان لے آؤ) یعنی جو صاحب ایمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، ایمان کے حقیقی تقاضوں کو بھی پورا کرے۔

پھر دوسروں کی خدمت ان کی مشکلات میں ان کی مدد، ان کی پریشانیوں کے بار کو جس حد تک ممکن ہو، ہلکا کرنے کی کوشش۔ اگر کچھ بھی ممکن نہیں ہے تو کم از کم ان کے لیے ہمدردی کا ایک میٹھا بول اور محبت کا ایک شیریں لفظ۔ جمعیت سے پہلے خاصا خود پسند تھا۔ میری دلچسپیاں زیادہ تر اپنے ہی تک محدود تھیں۔ دوسروں کے بارے میں بالکل اسی طرح سوچنا جس طرح اپنے بارے میں سوچتا ہوں، شاید میں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ بلکہ میں ندامت کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ خود اپنے سگے بھائیوں کے لیے بھی پورے طور پر یہ جذبات نہ تھے۔ اسی لیے اگر میری چیز کوئی بھائی لے لیتا تھا میں اس پر خندہ پیشانی سے صبر کرنے کی بجائے اس سے روٹھ جایا کرتا تھا۔ بات بچپن کی ہے مگر طبیعت کے رجحان کو ظاہر کرتی ہے۔ جمعیت میں آنے کے بعد میرے نقطہ نظر میں تبدیلی ہوئی اور ایک قسم کی اجتماعیت پسندی طبیعت میں پیدا ہوئی اور اپنوں اور دوسروں سب کے لیے میرا دل کھل گیا۔

اور سب سے قیمتی چیز جو یہاں آ کر مجھے حاصل ہوئی وہ اچھی رفاقت اور آداب رفاقت ہیں۔ گھر کی محدود سی فضا کے باہر میں نے نفسانفسی تو بہت دیکھی تھی، لیکن اپنے ساتھیوں کے لیے مخلصانہ محبت اور دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی خیر خواہی کا نظارہ نہیں کیا تھا۔ چوٹم چوٹ اور طنز و استہزا تو ہم نے بہت کیے تھے۔ لیکن ہمدردی اور اخوت سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ جمعیت کے ماحول میں خلوص اور محبت کی فراوانی جو میں نے پائی اور طبیعت نے اس سے جو نیا مزاج پیدا کیا وہ میرا قیمتی ترین اثاثہ اور ایک حیثیت سے میری آج تک کی زندگی کا حاصل ہے۔ ذاتی طور پر بھی ہم لوگوں کے تعلقات اتنے قریبی اور گہرے تھے کہ ان کے تصور سے حلاوت محسوس ہوتی ہے۔ دکھ درد کے شریک، خوشی غمی کے ساتھی، ایک کی پریشانی سب کی پریشانی تھی، ایک کی خوشی سب کی خوشی، ایک دوسرے کے لیے ایثار و قربانی، اپنے سے زیادہ دوسرے کے آرام کا خیال، کوشش کر کے ایک دوسرے سے برابر ملنا اور اگر چند دن بھی ملے بغیر گزر جائیں تو یہ کیفیت کہ

جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

سچی بات یہ ہے کہ جمعیت کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بے شمار انعام و اکرام کیے ہیں۔ لیکن باہمی محبت کا جو منظر میرے زمانے کی جمعیت میں تھا، اسے میں ابھی تک دوبارہ نہیں پا سکا ہوں۔ ہمارے تزکیہ و اصلاح میں باہر کا کوئی موثر عامل نہ تھا، یہ اندرونی ماحول ہی تھا جس نے دل درگاہ کو بدل دیا اور ہمیں دین کی نہایت حقیر سی خدمت کا موقع دیا۔

☆☆☆☆☆

جمعیت نے مجھے ایک اور چیز بھی دی اور وہ صلاحیتوں کی ترقی، میں جب اپنی صلاحیتوں کے نشوونما پر غور کرتا ہوں تو صاف نظر آتا ہے کہ جمعیت میں آنے کے بعد گراف ایک دم اوپر اٹھنے لگا اور وہ کیفیت پیدا ہوئی جسے (Shotting up) کہتے ہیں۔ جن صلاحیتوں کے بارے میں پہلے میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، اب اس طرح ابھر رہی تھیں جس طرح چشمے سے پانی، حقیقت یہ ہے کہ میں نے بولنا، لکھنا، سوچنا، اجتماعی معاملات سے عہدہ برآ ہونا، نظم کو چلانا اور لوگوں سے معاملہ

کرنا غرض ہر چیز جمعیت میں ہی سیکھی ہے۔

فطرت کا اصول ہے کہ کش مکش اور پیکار میں صلاحیتیں ابھرتی ہیں۔ تاریخ کے وہ دور جن میں سب سے زیادہ کش مکش اور جدوجہد رہی، وہی سب سے زیادہ مردم خیز ثابت ہوئے ہیں۔ خود مجھے عملی تجربے سے اس بات کا اندازہ ہوا کہ جدوجہد کی زندگی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر دیتی ہے اور نئی صلاحیتوں کو رو بکار لانے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ بقول اقبال:

جس میں نہیں کشمکش موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات، کشمکش انقلاب

جمعیت نے مجھے ایک اجتماعی جدوجہد میں شرکت کا موقع دیا۔ یہاں قدم قدم پر چیلنج ابھرے اور نئے نئے تقاضے پیدا ہوئے۔ یہاں مخالفتیں بھی ہوئیں اور نامساعد حالات بھی آئے۔ یہاں مشکلات بھی سنگ راہ بنیں، غیروں کی دشمنی اور اپنوں کی ناوک فگنی ہر چیز سے سابقہ پڑا لیکن یہ کش مکش میری صلاحیتوں کے لیے صیقل ثابت ہوئی۔ مجھے اپنے بارے میں ہرگز کوئی غلط فہمی نہیں، من آنم کہ من دانم! لیکن جو کچھ پایا، اسی جدوجہد اور اسی کش مکش میں پایا۔

پھر میرا ایمان ہے کہ اگر ہم خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ خدا کے دین کے خادم بنکر اٹھیں گے تو اللہ تعالیٰ کے خزانہ غیب سے صلاحیتوں کی ہم پر بارش ہوگی۔ صلاحیتوں خداداد ہوتی ہیں اور خدا حی و قیوم ہے۔ اس کی تخلیق کا کارخانہ ہر دم جاری رہتا ہے۔

دمادم رواں ہے دم زندگی
ہر ایک شے سے پیدا رم زندگی

کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کے لیے اٹھیں اور وہ ہمیں ان صلاحیتوں سے نہ نوازے، جو اس کام کو انجام دینے کے لیے درکار ہوں۔ میں نے اپنی تحریکی زندگی میں صلاحیتوں سے نوازے جانے کے اتنے واقعات دیکھے ہیں کہ اب اس چیز پر مجھے صرف ''ایمان بالغیب'' ہی نہیں، ایمان بالشہود بھی حاصل ہے۔ خود اپنے بارے میں، میں پوری ایمانداری سے عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ

کا جو بھی انعام ہوا ہے وہ جمعیت کے زمانے ہی میں ہوا ہے۔ یہ عطیہ ہے اللہ تعالیٰ کا اور ذریعہ بنی ہے اسلامی جمعیت طلبہ!

☆☆☆☆☆

جمعیت نے مجھے صلاحیتوں سے ہی نہیں نوازا، مجھے جذبہ عمل بھی دیا۔ طبعاً میں سست واقع ہوا ہوں، دل چاہتا ہے کہ میرے سارے کام میرے لیے ہو جائیں اور میں بس کتاب لیے پڑھتا رہوں۔

بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

جمعیت نے مجھے ایک مصروف اور سرگرم زندگی کا عادی بنایا۔ یہاں میں نے اپنے ہاتھ سے خود کام کرنا سیکھا اور اپنی تمام قوتوں کو حق و باطل کی جدوجہد میں جھونکنے کا جذبہ اور داعیہ حاصل کیا۔ یہ جمعیت ہی ہے جس کی وجہ سے مجھے دین کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنے اور اس کے غلبہ کی جدوجہد میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ سکون و آرام کی زندگی ختم ہوئی، حرکت اور جدوجہد کی زندگی شروع ہوئی۔ عمل کی صلاحیتیں پیدا ہوئیں اور جذبہ جہاد بیدار ہوا۔ میں نے اس حقیقت کو یہاں آ کر جانا کہ

زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

☆☆☆☆☆

آج جمعیت کو الوداع کہے آٹھ سال ہو چکے ہیں، اتنی مدت کے بعد جب میں آج اپنے جمعیتی دور پر غور کرتا ہوں، تو جمعیت مجھے باران رحمت کی طرح نظر آتی ہے۔ جس نے دل کھول کر ہم سب کو سیراب کیا۔ میری اور میرے رفقاء کی حیثیت مختلف ندی، نالوں کی مانند ہے، جنہوں نے اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس رحمت خداوندی سے فائدہ اٹھایا۔ ہم میں جو کمی رہ گئی، اس کی وجہ آسمانوں سے نازل ہونے والی اس بارش کی عدم فراوانی نہیں، بلکہ ہماری اپنی تنگ دامانی تھی۔

(الرعد، رکوع ۲)

(اس نے آسمانوں سے مینہہ برسایا، پھر اس سے اپنے اپنے اندازے کے مطابق نالے بہہ نکلے)۔

اور جب اپنی اس کیفیت کا اندازہ کرتا ہوں جو جمعیت، میری حقیقی محسنہ کو چھوڑتے وقت مجھ پر طاری تھی تو بجز اس کے اور کچھ نہیں کہہ پاتا

اٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے لیکن
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

بہرحال ہماری حیثیت دین کے چند ادنیٰ خادموں کی سی تھی، اپنے وقت پر ہم نے جمعیت میں مقدور بھر کام کیا۔ اب ہماری جگہ خدا نے کچھ اور لوگوں کو منتخب کر لیا ہے جو تعلیمی دنیا میں حق کی شمعیں روشن کیے ہوئے ہیں اور اس پرچم کو اٹھائے ہوئے ہیں، جسے اٹھانے کی سعادت کبھی ہمیں حاصل تھی۔ ہم اپنے وقت پر اس خاص میدان کار سے ہٹ گئے لیکن خدا کا شکر ہے اس اطمینان کے ساتھ کہ

ہمیں یقین ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے

☆☆☆☆☆